کی ایک بڑی سی ڈلی ہے۔" میں سمجھتا ہوں اس علاقے میں خواجہ سے زیادہ خوش قسمت اور کوئی آدمی نہیں گزرا۔ کم از کم میری زندگی میں ایسا کوئی انسان نہیں آیا جس کے ساتھ ایک نوعمر لڑکی نے اس طرح سے محبت کی ہو۔

پھر ایک دن تازی اپنے وعدے کے خلاف بہت لیٹ پہنچی اور خواجہ جسے میں نے اپنی زندگی میں کبھی پریشان نہیں دیکھا تھا بہت بے چین نظر آیا۔ وہ پُرسکون صاحب عزم و ہمت استقلال کا مجسمہ کبھی چارپائی پر لیٹتا، کبھی اُٹھ کھڑا ہوتا۔ کبھی کھڑکی سے سر نکال کر سڑک پر دیکھنے لگتا۔ کبھی گھڑے سے پانی پیتا۔ کبھی سگریٹ سُلگاتا اور پھر آکر چارپائی پر لیٹ جاتا۔ تازی آئی اور اپنے بُرقعے کے بند کھولتے ہوئے مسکرانے لگی۔ اس نے ایک آنکھ میچ کر خواجہ کی طرف دیکھا اور نعرہ مار کر کہا۔ "سور ہے ہو سجنو۔" خواجہ نے اسی طرح لیٹے لیٹے کہا۔ "بس ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔" وہ خواجہ کے پہلو میں دراز ہو گئی اور اسے گدگدی کر کے کہنے لگی۔ "دیکھو میں تمہارے لیے کیا لائی ہوں۔" خواجہ نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے ہاتھوں میں خاکی رنگ کا ایک لفافہ تھا اور اس لفافے میں خواجہ کے لیے قمیص کا بادامی کپڑا تھا۔ "پسند ہے؟" اس نے اٹھلا کر پوچھا۔

"کس کے لیے ہے؟" خواجہ نے لاتعلقی سے کہا۔

"تمہارے لیے اور کس کے لیے۔"

"کیوں؟"

"کیوں کیا؟" تازی نے جل کر کہا۔ "قمیص کا کپڑا ہے مجھے پسند آگیا، میں نے لے لیا۔"

"یہ تو کم ہے۔" خواجہ نے معصومیت کے ساتھ جواب دیا۔ "مجھے تو اب چودہ گز لٹھا چاہیے۔"

"چودہ گز لٹھا! اکیلے؟" تازی نے بُرا مان کر کہا۔

"ہاں۔" خواجہ بولا۔

"پھر تو ہمیں اٹھائیس گز لینا پڑے گا۔ مجھے بغیر کفن کے دفن کرو گے؟"

خواجہ نے کہا۔ "بس رہنے دے!"

پھر ان کے درمیان کچھ اچھی باتیں نہ ہوئیں۔ دونوں طرف سے جلے کٹے سے جملے اُبھرتے رہے۔ دونوں ایک دوسرے سے کھنچے رہے۔ اس تناؤ میں خواجہ بنسی کی ڈوری کو ڈھیل دیتا

رہا اور وہ پھنسی ہوئی رو ہو کی طرح تڑپتی اور تنتی رہی۔ پھر وہ قمیص کا لفافہ دہیں پھینک کر بڑبڑاتی ہوئی فلیٹ سے باہر نکل گئی۔

شام کو مَیں اور خواجہ فلم دیکھنے گئے۔ اس نے میرے ساتھ کئی باتیں کیں۔ مختلف قسم کی عورتوں کو رام کرنے کے طریقے بتائے، لیکن اپنی ہی باتوں میں وہ خود موجود نہیں تھا، ریکارڈ کی طرح بول رہا تھا۔ فلم دیکھتے ہوئے بھی اس کی نگاہیں گو پردے پر مرکوز تھیں، لیکن اس کے ذہن کے اندر کوئی اور پروجیکٹر چل رہا تھا۔

ایک شام کھوکھے پر چائے پیتے ہوئے خواجہ نے مجھے بتایا کہ تازی کو کسی سے عشق ہو گیا ہے۔ میرے ہاتھ سے پیالی چھُوٹ کر زمین پر گر گئی۔ اس نے میری پیالی زمین سے اُٹھا کر لڑکے کو آواز دی اور پھر کہنے لگا "جب عورت تم سے آنکھ ملا کر بات کرنے کے بجائے کندھوں پر سے یا پہلو کی طرف سے نظریں گزار کر بات کرنے لگے تو سمجھ لو وہ سٹیشن بدلنے لگی ہے۔"

مَیں نے کہا "چھوڑو یار خواجہ، کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ تازی اور اس کو کسی سے عشق ہو جائے۔ تمہارے ہوتے ہوئے!"

خواجہ نے کہا "ہر انسان کے اندر ایک میٹر ہوتا ہے۔ کیا مرد کیا عورت، سبھی میٹر پڑھ کر بتا سکتے ہیں کہ محبوب کا رُخ کس طرف ہے۔"

مَیں نے کہا "یہ میٹر کالے عِلم کا ہو گا۔ ہر ایک کے پاس تو نہیں ہوتا۔"

وہ میری بات سُن کر بھنا گیا اور جل کر بولا "اُلو کے پٹھے اس میں کالے علم کا کوئی دخل نہیں۔ یہ میٹر ہر شخص کو فِٹ کیا کرایا ملتا ہے۔ جھُک کر پڑھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ خود ہی سگنل دیتا ہے۔ خود ہی فریکوینسی سیٹ کر دیتا ہے۔"

مَیں نے کہا "خواجہ یہ سب تیرے وہم ہیں۔ اب تُو واقعی بُوڑھا ہوتا جا رہا ہے۔"

اس نے لال لال آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھر نظریں زمین پر گاڑ دیں۔

مَیں نے خفیہ طریق پر یہ بات تازی کو بتا دی۔ پہلے اس کا چہرہ غصّے سے لال ہوا پھر ایک دَم پیلا ہو گیا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر بولی "سچ بتا سجی، اس کو کیسے معلوم ہوا؟"

یہ فقرہ سُن کر میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ میرے سامنے کھڑی ہوئی تازی ایک دَم معدوم ہو گئی۔ پھر آموجود ہوئی۔ پھر دھُواں سا بن کر ڈنوا لو ہو گئی۔ پھر چوبی مجسّمے کی طرح سامنے آ کھڑی

ہوئی۔ ایک دم زوم آؤٹ ہو کر نقطہ سا بن گئی۔ اچانک زوم اِن ہو کر میری ناک سے آ لگی۔ اس کے چہرے کا ایک ایک مسام چھوٹے چھوٹے جوہڑوں کی طرح پانی سے بھر گیا۔ مَیں نے کہا: "تم نے کیا کہا تازی؟"

تازی نے کہا: "وہ بندر روڈ پر کتابوں کی ایک دُکان میں اکاؤنٹنٹ ہے اور ایف اے پاس ہے۔"

"کون؟" مَیں نے چیخ کر پُوچھا۔

"مَیں اس سے شادی کرانا چاہتی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"لیکن خواجہ؟ مجھے اس سے آگے کوئی اور لفظ نہ سُوجھا۔

وہ رونے لگی اور میرے ساتھ چمٹ کر بولی: "مَیں خواجہ سے پیار کرتی ہوں۔ اس کو اپنی جان سمجھتی ہوں۔ مَیں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔"

مَیں نے کہا: "تمہارے ماں باپ یہ شادی طے کر رہے ہیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا اور زور زور سے رونے لگی۔

روتی ہوئی عورت سے بات کرنا، اس کی بات سمجھنا، اس کے لفظوں کو پہچاننا اور اس کی سوچ تک پہنچنا بڑا مشکل کام ہے۔ مَیں زور زور سے اس کو جھنجھوڑنے لگا۔ جُوں جُوں مَیں اس کو ہلاتا تھا وہ اور زور زور سے رونے لگتی تھی۔ پھر مَیں تھک ہار کر خاموش ہو گیا۔

مَیں نے وہ لڑکا نہیں دیکھا اور نہ اس سے کبھی ملا، لیکن تازی کی زبانی معلوم ہُوا کہ ایک شام جب وہ خواجہ سے مل کر واپس آ رہی تھی اور راستے میں موسلا دھار بارش ہونے لگی تھی، تو رکشا تلاش کرنے میں اس لڑکے نے تازی کی مدد کی تھی۔ جب وہ رکشا میں بیٹھ چکی تھی تو اس لڑکے نے رکشا ڈرائیور کو "ذرا ٹھہرو" کہہ کر روکا تھا اور تازی کے کیچڑ میں لپے ہوئے پلّو کو زمین سے اُٹھا کر نچوڑا تھا اور پھر اس کو تازی کے پاؤں کے پاس رکھ کر ایک طرف ہو گیا تھا۔

"خواجہ میری زندگی کی پہلی محبت ہے" میرا پہلوٹی کا عشق ہے۔" تازی رونے لگی: "لیکن الطاف ہمدرد ہے۔ دِل رکھنے والا ہے۔ خاموش ہے۔"

"اور جوان ہے۔" مَیں نے کہا: "تمہارا ہم عمر ہے۔"

اس نے میرے منہ پر زور کا ایک تھپڑ مارا اور کھینچ کر بولی: "تم ہر ایک کو اپنے جیسا مرد ہی

سمجھتے ہو کہ انسان کے بجائے صرف جوانی سے محبت کرتا ہے۔"

ہم دونوں خاموش ہو گئے اور یہ خاموشی بڑا طول کھینچ گئی۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں میری کلائیاں پکڑ لیں اور منمنا کر بولی۔ "بتاؤ سجنی میں اب کیا کروں؟ کس دیوار سے سر ماروں اور کہاں جا کر مروں؟"

میں نے کہا۔ "اس میں مرنے کی کیا بات ہے۔ خواجہ کو چھوڑ دو۔ اس کے ساتھ کوئی تم نے ٹھیکہ تو نہیں کیا؟"

"لیکن وہ مر جائے گا۔" اس نے غمزدہ ہو کر کہا۔ "وہ اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے گا۔"

"کچھ نہیں ہوتا۔" میں نے یقین کے ساتھ کہا۔ "وہ کھیلا کھایا آدمی ہے۔ کوئی ایک تیرے ساتھ ہی تو وابستہ نہیں۔"

"میں جانتی ہوں اس کے بہت سے یارانے ہیں اور بڑی عورتوں سے اس کا تعلق ہے، لیکن اس کی وابستگی صرف میرے ساتھ ہے۔"

"یہ تم سے کس نے کہا؟"

"میرے وجود نے!"

"تمہارے وجود کے اندر کوئی میٹر لگا ہے؟"

"ہاں لگا ہے۔"

"پھر؟"

"بڑی مشکل بات ہے۔ اس کا کوئی حل نہ مل سکے گا۔"

"تم آہستہ آہستہ خواجہ کو چھوڑ دو۔"

"میں آہستہ آہستہ ہی اس کو چھوڑ رہی ہوں۔"

"اور اس بات کا تمہیں رنج ہے؟"

"اب تو نہیں لیکن بعد میں شاید ضرور ہو گا۔"

"بعد سے کیا مطلب؟"

"بعد سے میری مراد وقت گزر جانے سے ہے۔"

"کیسا وقت ہے"

وہ پھر خاموش ہو گئی اور کچھ سوچنے لگی۔

خواجہ کے فلیٹ میں میں اندر چائے بنا رہا تھا۔ تازی اپنی مخصوص چارپائی پر لیٹی تھی اور اس نے اپنے کھڑے زانو پر دوسری ٹانگ کی پنڈلی جما رکھی تھی۔ تکیہ پیٹ پر رکھا تھا اور تکیے پر دونوں ہاتھوں کی کنگھی ڈالی ہوئی تھی۔ خواجہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ کہنیاں کرسی کے بازوؤں پر تھیں اور پیر ایک دوسرے سے جوڑ رکھے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا: "اس سے کچھ نہیں ملے گا تازی کچھ بھی نہ مل سکے گا۔"

"مجھے اس سے سب کچھ ملے گا۔ وہ ہمدرد ہے، رحم دل ہے، مددگار ہے، مہربان ہے۔"

"یہ سب صفتیں تو خدا میں موجود ہیں تازی۔" خواجہ نے کہا: "اس سے کسی کو کیا ملتا ہے؟"

"وہ تم جیسا نہیں۔" تازی نے چمک کر کہا: "وہ انسان ہے۔"

"میں اس جیسا بننے کی کوشش کروں گا۔" خواجہ نے رو کر کہا۔

"اب وقت گزر گیا خواجہ۔" تازی نے ہولے سے کہا: "تم اس جیسے کیسے بن سکو گے؟"

"میں بن جاؤں گا۔ بن جاؤں گا۔ بن جاؤں گا۔ تم مجھے ایک چانس تو دو۔"

"میں نے تم کو بڑے چانس دیئے۔ لیکن تم وہی رہے جو پہلے تھے۔"

"ایک چانس۔ آخری چانس۔ آخری موقع۔"

"اب بہت مشکل ہے۔"

"حرامزادی، کتی، بے وفا۔" خواجہ غصے سے کرسی سے اٹھا اور اس نے اپنی ہوائی چپل اٹھا کر تازی کے گال کی طرف تانی۔ پھر وہ دیوانہ وار اس کے کھڑے پاؤں کو چومنے لگا اور زور زور سے رونے لگا۔ اس کے رونے کی آواز سن کر میں نے آگے بڑھ کر دروازے کی اوٹ میں سے دیکھا۔ وہ پاگلوں کی طرح تازی کا پاؤں چوم رہا تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں ہوائی چپل تھی۔ تازی ہنس رہی تھی اور ہنسنے سے اس کا سارا بدن ہل رہا تھا اور وہ زور زور سے کہہ رہی تھی: "خدا کے لیے، خواجہ اللہ کے واسطے۔ ٹھہرو مجھے گدگدی ہو رہی ہے۔ میرا دم نکلا جا رہا ہے۔ ایک منٹ میری بات تو سنو۔ میرے تلووں سے تمہاری مونچھ رگڑ کھا رہی ہے۔ مجھے

بڑی ہنسی آرہی ہے۔ خدا کے لیے، اللہ رسولؐ کے لیے۔" پھر اس کی ہنسی بند ہوگئی اور کمرے میں بڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔

میں چائے کا ٹرے لے کر ان کے کمرے میں گیا، لیکن دروازے سے ہی پلٹ آیا۔ وہ اس حالت میں تھے کہ ابھی چائے نہ پی سکتے تھے۔

۱۶ مئی کو تازی کی شادی تھی۔ خواجہ مجھے اپنے ساتھ لے کر اس کے محلے میں گیا اور ہم بڑی دیر تک اس کے گھر سے دُور اس شادی کا نظارہ کرتے رہے۔ بابر رنگ برنگ بجتے نیلے پیلے کپڑے پہنے کھیل رہے تھے۔ عورتیں آجا رہی تھیں۔ مرد کرسیاں اور مونڈھے ڈال کر گلی میں بیٹھے تھے۔ ایک طرف دو دیگیں پک رہی تھیں۔ اِکّا دُکّا مہمانوں کے رکشے آآ کر رُک رہے تھے۔ جب بارات آئی تو خواجہ نے کہا: "آؤ چلیں۔"

میں نے کہا: "ابھی دو گھڑی اور ٹھہرو۔ یہ آخری نظارہ بھی دیکھ لیں۔"

اس نے مجھے ماں کی گالی دے کر کہا: "اب چل۔ کافی نظارے دیکھ لیے۔ جا کر کھانا بھی کھانا ہے۔"

ہم نے ایک ٹیکسی لی اور کیفے جارج کھانا کھانے چلے گئے۔ موسم کے آثار کچھ اچھے نہیں تھے۔

پھر دن آہستہ آہستہ گزرنے لگے۔ خواجہ اپنے تجربے کے بَل پر اور کالے علم کے زور پر مجھ سے کہا کرتا: "تم دیکھ لینا، تازی آئے گی اور ضرور آئے گی۔ وہ مجھے بُھلا دے تو بُھلا دے، لیکن اس ٹانسے کی چادر کو نہ بُھلا سکے گی جس کے نیچے ہم دونوں لیٹا کرتے تھے۔"

علم کا سہارا بھی بڑا کمزور سہارا ہے۔ ایک تیراک اپنے علم اور تجربے کے زور پر بپھرے ہوئے دریا اور بحرِ بے کراں پار کر جاتا ہے اور اسی علم اور تجربے کی بنا پر جھیل کے بند پانی میں ڈوب جاتا ہے۔ کبھی کُھل جا سم سم کہنے سے بند دروازے کُھلنے لگتے ہیں اور کبھی اسی ورد کے وظیفے سے دروازوں کے آگے پتھر گرنے لگتے ہیں اور سنگین دیواریں اُٹھنے لگتی ہیں۔

پُورے سولہ دن بعد تازی خواجہ کے فلیٹ میں آئی۔ اس نے قرمزی رنگ کا سُوٹ پہنا ہوا تھا اور دوپٹے کو سچے گوٹے کا دو دو اُنگل چوڑا حاشیہ لگا تھا۔ اس کے چہرے پر مایوسی، بیزاری

اور اُداسی کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے اپنا پرس چارپائی پر لیٹے ہوئے خواجہ کے سرہانے رکھ دیا اور خود کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کا سر جُھکا ہُوا تھا۔ کُہنیاں کرسی کے بازوؤں پر تھیں اور سینڈلوں والے پاؤں ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے تھے۔ خواجہ نے اسی طرح لیٹے لیٹے تکیے کے نیچے سے سگریٹ نکالا اور آرام سے سُلگا کر بولا: "کیسی ہو تازی؟"

"اچھی ہوں۔"

"اچھی کہ بہت اچھی؟"

"بس ٹھیک ہے۔"

"کیسا ہے تمہارا خاوند؟"

"ٹھیک ہے۔"

"خوب فٹ فٹوس رہے اتنے دِن؟"

"ہاں جی۔"

"بڑے اچھے کپڑے پہن رکھے ہیں۔"

"شکریہ۔"

"میکے کے ہیں یا سُسرال کے؟"

"سُسرال کے۔"

"میرا تو خیال تھا تم جلد آؤ گی۔"

"میرا بھی یہی ارادہ تھا، لیکن الطاف نے دکان سے چھُٹی لے رکھی تھی۔"

"الطاف نام بہت اچھا ہے۔"

"ہاں جی۔"

"کتنی عمر ہو گی اس کی؟"

"مجھ سے چھ سال بڑا ہے۔"

"پھر تو بڑا جوان ہو گا۔"

"ہاں جی۔"

"آؤ" خواجہ نے ایک طرف ہوکر کہا" لیٹ جاؤ"

"نہیں جی شکریہ"

"تم تھک گئی ہوگی"

"نہیں جی کوئی ایسی خاص تھکی بھی نہیں"

"پھر بھی لیٹ تو جاؤ"

"اب میں چلتی ہوں جی" اس نے آگے بڑھ کر اپنا پرس اُٹھالیا۔ خواجہ نے اس کی کلائی تھام لی اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ زور لگانے لگی تو خواجہ نے ایک ہی جھٹکے سے اس کو چارپائی پر گرالیا۔ تازی رونے لگی۔ کچھ اس کو اپنے پہلوٹھ کے عشق کی موت کا غم تھا۔ کچھ اپنے مستقبل کا خوف، کچھ پرانی یادوں کا دُکھ، کچھ نئی زندگی میں داخل ہونے کا قلق، کچھ الطاف سے دُوری کا رنج۔ بڑے بڑے موٹے موٹے آنسو اس کے گالوں پر تیزی سے پھسلنے لگے۔ خواجہ نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا تو اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اُسے پرے دھکیل دیا۔ پھر ان دونوں کے درمیان چھینا جھپٹی اور ہاتھا پائی شروع ہوگئی۔ وہ رو رہی تھی، کراہ رہی تھی اور اپنے بڑے ناخن خواجہ کی کلائیوں میں گاڑ رہی تھی۔ خواجہ ہانپ رہا تھا اور کانپ رہا تھا اور غصے میں بول رہا تھا" ایک مرتبہ۔ بس ایک مرتبہ۔ صرف ایک بار، آخری بار" اور تازی "نہیں نہیں نہیں" کہہ کر اس سے جان چھڑا رہی تھی۔ پھر میں نے اپنے کمرے میں تازی کو اس کے چنگل سے نکل جانے کی کھڑاک سُنی۔ اُس کا سر دروازے سے اور اس کا پرس کرسی سے ٹکرایا تھا۔ خواجہ اس کے پیچھے اُبھرا لیکن وہ دروازہ کھول کر نکل چکی تھی۔ تازی مینشن کی سیڑھیاں تیزی سے اُتر رہی تھی اور خواجہ اسے آوازیں دے رہا تھا" تازی! تازی! تازی" کی آوازیں گھومتی ہوئی سیڑھیوں کے درمیان دیوار کے ساتھ چکر لگاتی اور ریلنگ کی سلاخوں کے درمیان سے بتدریج نیچے گرتی جاتی تھیں۔

میں نے جاکر خواجہ کو دونوں کندھوں سے تھاما اور واپس لاکر چارپائی پر ڈال دیا۔ وہ مجھے دیکھ کر شرمندگی سے مسکرایا اور سگریٹ سُلگا کر بولا" ایسے ہی ایک شام مگا چو مجھے دراس جرمن لڑکی کو دیکھ کر بھاگی تھی اور اس نے اپنے جھونپڑے میں جاکر خودکشی کر لی تھی"

میں نے کہا: "خواجہ یہ بھی مجھے ناخوش دکھائی دیتی ہے۔"

اس نے سگریٹ کا ایک لمبا سا کش لگا کر کہا: "آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گی۔ شادی میں پہلے پہل یہی ہوتا ہے۔"

اگلے روز سہ پہر کے قریب میں خواجہ کا دروازہ دیر تک بجاتا رہا، لیکن اس نے اندر سے کنڈی نہ کھولی۔ میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے اٹھنے لگے اور میں نے خوفزدہ ہو کر دروازہ اور زور سے بجانا شروع کر دیا۔ ساتھ کے فلیٹ سے ادھیڑ عمر کی ایک عورت نکل کر بولی: "وہ آج سویرے کا نکل گیا ہے۔"

"لیکن دروازہ تو اندر سے بند ہے۔" میں نے کہا۔

"اوہ، دوسرے والے کو تالا لگا کر گیا ہے۔ چھوٹے والے کو۔" عورت نے جواب دیا۔

میں نے دیکھا خواجہ کے فلیٹ کا دوسرا چھوٹا دروازہ جو کبھی نہ کھلا تھا باہر سے تالا بند تھا۔ میں دل ہی دل میں خواجہ کے بارے میں سوچتا اس کے مختلف ٹھکانوں کی کھوج میں سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔ تیسرے روز جب ہم کو خواجہ کی پوسٹ مارٹم رپورٹ ملی، تو اس میں لکھا تھا کہ موت نیلا تھوتھا کھانے کی وجہ سے ہوئی ہے۔

سیف الملوک کے پہاڑوں کی گونج نرالی ہے۔ بڑی آہستگی سے کہی ہوئی بات بڑی دیر کے بعد دیسی کی دیسی لوٹ آتی ہے۔ مُنّی کی بات اپنی مسافت طے کر کے لوٹ رہی تھی۔ بوڑھے کو سب سے بڑا دھچکا اس وقت لگتا ہے جب وہ کسی عورت سے ملاپ کا خواہشمند ہو۔ اس کا اظہار کرے اور پھر اس کو صاف انکار کر دیا جائے۔ وہ ایک نوجوان کی طرح اس انکار کے خلاف احتجاج نہیں کرتا، شور نہیں مچاتا، طعنے نہیں دیتا۔ چپ چاپ سُن لیتا ہے اور پی جاتا ہے۔ اس انکار کے بعد وہ اپنے گرد و پیش سے، اپنی خوراک سے، اپنے لباس سے لاتعلق ہو جاتا ہے اور ایک دن اپنے کپڑے اٹھا کر گھر کے کسی کمرے میں جاتا ہے اور وہاں جا کر خاموشی سے مر جاتا ہے۔

ہم پھر آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھنے لگے اور ہم میں سے ایک ایسا بھی تھا جس نے سولہ سال ایک لڑکی کے ساتھ بے پناہ محبت کی تھی اور اپنی اور اپنے گھر والوں کی ساری زندگی اس محبت کی دہلیز پر قربان کر دی تھی۔ اس وقت وہ لیڈر کے ساتھ ساتھ خاموشی سے چل رہا تھا اور اس کے ہر قدم کے

ساتھ سوچ کی زنجیریں بج رہی تھیں۔ سوچ، یاد، خیال، حافظہ صرف ذہن کے کھونٹے سے نہیں بندھے ہوتے۔ ان کی ایک ڈور چلنے سے بھی بندھی ہوتی ہے۔ فلموں میں سوچنے والے آدمی کو آگے پیچھے چلتے دکھاتے ہیں۔ پنجاب کے لوگ گو طنزاً کہتے ہیں کہ فلاں کی عقل گٹوں میں ہے، لیکن حقیقت میں شاید ان کی سائیکی دریافت کر چکی ہے کہ عقل کا اور سوچ کا ٹخنوں سے گہرا تعلق ہے۔ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا انسان خاموش اور پُرسکون ہوتا ہے، لیکن جب اس کی سوچ کے گرد اس کے شعور اور لاشعور کا عمل الیکٹرون اور پروٹون کا پیٹرن بنانے لگتا ہے، تو اس کا پاؤں اس کا گھٹنا یا پوری ٹانگ آپ سے آپ ہلنے لگتی ہے اور سارے جسم میں ارتعاش پیدا کر دیتی ہے۔ یہ ارتعاش اور آرگن ازم کا ارتعاش ایک ہی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہوتا ہے کہ ایک ہائی فائی ہوتا ہے اور دوسرا لو فریکوئنسی کا۔ انسانوں نے جب سے ٹانگوں کا استعمال کم کر دیا ہے اور چلنے کے عمل کو محدود بنا دیا ہے۔ اس وقت سے ان کی جبلی سوچ میں مکانکی رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ روبوٹ کی طرح مسائل حل کر دیتے ہیں، لیکن دوسرے جانداروں کی طرح مسائل کی فطرت اور ان کی رُوح سے واقف نہیں ہوتے۔ ان کے مسائل کے درمیان ایک رشتہ پیدا نہیں ہوتا۔ آپس میں نیوندرا بھاجی کا برتارا نہیں ہوتا۔ میں اعداد و شمار تو پیش نہیں کر سکتا، لیکن اپنے مشاہدے کی بنا پر ایک بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ لفٹ میں سوار ہو کر پندرھویں منزل پر جا کر اپنی محبوبہ سے ملنے والا انسان اس نوجوان سے مختلف ہوتا ہے جو کوٹھے ٹاپ کر اور اپنے گٹے گوڈے چھلوا کر محبوبہ کے بالاخانے میں پہنچتا ہے جو اپنی پیش قدمی میں اپنی ٹانگیں استعمال کرتا ہے اور انہیں اپنے ذہن اور اپنی سوچ کے ساتھ ہم آہنگ کرتا ہے۔ اسی طرح کار میں سوار ہو کر وقتِ مقررہ اور مقامِ مقررہ پر پہنچنے والا عاشق جب اپنی محبوبہ سے ملتا ہے تو اس کے ذہن اور بدن کا عمل اس نوجوان سے مختلف ہوتا ہے جو نہر کنارے کیکروں کے درختوں میں بھاگتا ہُوا پُرانی پُلی کا چکر کاٹ کر ویران آوے کے پیچھے سے ہو کر کھیت میں ساگ توڑتی محبوبہ سے ملتا ہے۔

قدم اور ذہن کا ساتھ بہت پُرانا ہے اور وہ جو ہم میں سے ایک قدم قدم چڑھائی چڑھ رہا تھا جس کا سر اور کندھے جھکے ہُوئے تھے جس کی باہر کو نکلی ہوئی منگمری پر جھولتا ہُوا میوزیک بج رہا تھا، بڑی تیزی کے ساتھ سوچ رہا تھا کہ فرزانہ نے سولہ سال کی دانہ دانہ محبت کو ہتھیلی پر مسل کر پھونک مار کر کس طرح اڑا دیا۔ اُس سے آنکھیں ملانے، تمسخر سے ہنسنے اور ہنہنانے کی قوت کیسے

حاصل کرلی اور اپنی خاموش سلگتی ہوئی محبت کو چنگی بجا کر پھلجھڑی میں کیسے تبدیل کر لیا اور پھر چیچو چیچ گنڈیریاں دو تیریاں دو میریاں کرتی ہوئی بے وفا عورتوں کے گروہ میں کس طرح شامل ہوگئی۔ جُوں جُوں اس کے قدم آگے کو بڑھتے اور اُوپر کو اُٹھتے تھے وہ آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف جا رہا تھا۔ اس دن کی طرف جب انہوں نے اپنے درمیان اظہارِ محبت کا ایک کوڈ سگنل قائم کیا تھا کہ جب ہم میں سے کوئی دوسروں کی موجودگی میں الفت کی شدت سے مرن کنارے ہو جائے اور اظہار کا کوئی ذریعہ نہ پائے تو وہ تین مرتبہ اپنی آنکھیں کھول کر پپوٹوں کو آہستگی سے بند کرے اور ٹھنڈی سانس کو اندر ہی جذب کر کے خاموش ہو جائے۔ اس سگنل کے کوئی چھ ماہ بعد ایک اور سگنل وضع ہُوا کہ جب فرزانہ رات کو اسے خدا حافظ کہے اور ہمارا دوست پتلون کی جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈال کر اپنے ویران گھر کا رُخ اختیار کرے اور اس کی روانگی کے پُورے اَسّی گننے کے بعد فرزانہ اپنے کمرے کی بتی تین مرتبہ بجھائے اور تین مرتبہ روشن کرے اس کے پھاٹک سے نکلنے پر دونوں اپنی اپنی جگہ دل ہی دل میں یہ مہارنی شروع کر دیتے۔ ساٹھ پر پہنچ کر ہمارا یار مُڑتا۔ جیبوں سے ہاتھ نکال کر سینے پر باندھتا اور ٹکٹکی باندھ کر روشن کھڑکی کی طرف دیکھنے لگتا۔ بتی بجھتی، پھر جلتی، پھر بجھتی پھر جلتی، پھر بجھتی اور جلنے لگتی۔ یہ واقعہ کوٹھیوں کے درمیان ٹوٹے ٹبّوں والی بنجر قدیم زمین میں سرکنڈے کے اس بُوجھے کے پاس پیش آتا جو جلا ہُوا تھا اور جس کی کالک سرمئی ہو کر آہستہ آہستہ ہم رنگِ زمین ہو رہی تھی۔ ہمارا دوست اس بُوجھے کے پاس بیٹھ کر خاکستر سے مسّے کرتا اور پھر جلتی ہوئی روشنی کی طرف منہ کر کے دو رکعت نفل ادا کرتا۔ سلام پھیر کر ہلکا پھلکا سا اُٹھتا اور سیٹی بجاتا ہُوا گھر کی طرف روانہ ہو جاتا۔

سردیوں کی ایک شام اس نے ایک نوجوان کو دیکھا جو فرزانہ کے گھرانے کے ساتھ آتش دان کے پاس بیٹھا تھا اور فرزانہ اس کو مالٹا چھیل کر دے رہی تھی۔ وہ ایک ایک پھانک لیتا صوفے پر ساتھ پڑی ہوئی پرچ سے نمک مرچ چھواتا اور گلوری سی منہ میں رکھ لیتا۔ فرزانہ نے تین پھانکیں چھیل کر ہمارے دوست کو بھی دیں جس نے انہیں اسی پرچ سے لتھیڑ کر کھایا اور پھر خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ فرزانہ اور اس کے گھر والے اس نوجوان کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے اور وہ ہنس ہنس کر جواب دیتا رہا۔ ہمارے دوست نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو ایک لمبی سی جمائی لے کر فرزانہ کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ تین مرتبہ اپنی آنکھیں کھولیں اور بند کیں۔ فرزانہ نے مالٹوں کے

لفافے کی گردن مروڑ کر لفافہ تپائی پر رکھا۔ پرنج اس نوجوان کے پہلو سے اُٹھا کر لفافے کے پاس رکھی اور جواباً تین مرتبہ آنکھیں کھولیں اور بند کیں۔ اس عمل میں آج پہلی مرتبہ کوئی پندرہ سیکنڈ کی دیر ہوئی، لیکن ہمارے دوست کا دل خوشی سے مفرح ہو گیا اور اس نے فرزانہ کے بہنوئی کو وہ لطیفہ سنانا شروع کیا جو اس نے پہلے کبھی نہیں سُنا تھا۔ لطیفے کے خاتمے پر گھر کے سب لوگ کھلکھلا کر ہنسے لیکن اس نوجوان نے مسکرانے پر اکتفا کی۔ فرزانہ بھی ہنسی لیکن اتنا زیادہ نہیں جس قدر اسے ہنسنا چاہیے تھا۔ ہمارا دوست پھر دردناک ہو گیا۔ باتوں کا سلسلہ سیاست سے نکلا، فیشن کے گرد گھوما اور پھر مقامی لوگوں کی زندگیوں پر محدود ہو گیا۔ اس اثنا میں رات کے دس بج گئے۔ فرزانہ کی امّی نے رائے دی کہ اب سونا چاہیے۔ آپا نے کہا ابھی تھوڑی دیر اور بیٹھا جائے۔ فرزانہ نے کہا آپا ٹھیک کہتی ہیں پانچ منٹ اور بیٹھا جائے۔ مالٹے والے نوجوان نے کہا پانچ منٹ زیادہ ہیں، تین منٹ اور بیٹھا جائے کیوں کہ کل مجھے انٹرویو دینے جانا ہے۔

فرزانہ نے کہا تین منٹ ٹھیک ہیں۔

ہمارے دوست نے کہا: "مجھے تو اجازت دیجیے مجھے جلدی گھر پہنچنا ہے۔"

اس جلدی پر سب لوگ قہقہہ مار کر ہنسے اور مالٹے والے نے کہا: "تین منٹ جلد پہنچ کر آپ کیا کر لیں گے؟"

ہمارے دوست نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ فرزانہ کا بہنوئی اور اس کی آپا بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ دونوں اسے پھاٹک تک چھوڑنے آئے اور جب وہ اسے شب بخیر کہہ کر پھاٹک سے نکلا تو اس کی مہارانی اپنی رفتار بھول گئی۔ ساٹھ گنتے گنتے وہ جلے ہوئے بُوجھے کے پاس پہنچ گیا۔ پھر اس نے پلٹ کر روشن کھڑکی کی طرف منہ کیا ہاتھ سینے پر باندھے اور انتظار کرنے لگا۔ بانوے اور ترانوے کے درمیانی وقفے میں بتی بجھی۔ پھر جلی پھر بجھی، پھر جلی پھر بجھی اور جلنے لگی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور جلدی جلدی دو رکعت نفل ادا کر کے تیزی سے گھر کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔

مالٹے والا انٹرویو دینے آیا تو پھر وہیں رہ گیا۔ ایک مہینہ دو مہینے اُوپر کئی اور اَن گنت دن۔ اس عرصے میں فرزانہ بڑی خوبصورت ہو گئی۔ اس کے کپڑوں سے اچھی اچھی خوشبو آنے لگی۔ اس کا قد پہلے سے لمبا ہو گیا اور وہ جو ایک گڑھا سا اس کے گال میں تھا وہ اور گہرا ہو گیا۔ اس عرصے

میں وہ ہمارے دوست کے ساتھ اور توجہ سے اور التفات سے پیش آنے لگی اور محبت کے اظہار میں پہلے سے نڈر ہو گئی۔

ایک دن ڈرائنگ روم سے گزرتے ہوئے اس نے ہمارے دوست کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور صوفے کے پیچھے کھڑے ہو کر کہنے لگی "تم اس طرح سے بڑے کیوں رہتے ہو؟"

"رہتا ہوں، میری مرضی" اس نے جل کر کہا۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی" اس نے ہنس کر کہا۔

"یہی تو بات ہے" اس نے اونچی آواز میں جواب دیا۔

اس پر فرزانہ قہقہہ مار کر ہنسی اور ہمارے دوست کے سر پر ہلکا سا ٹھوکا مار کر کہنے لگی "تم بالکل کاکے ہو۔ چھوٹے سے کاکے"

"ہاں میں کاکا ہوں لیکن تمہیں اس سے کیا"

وہ یہ بے بُودہ جواب سُن کر اور زور سے ہنسنے لگی اور ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

"ہنسے جاؤ، ہنسے جاؤ" ہمارے دوست نے سر جھکا کر کہا "اب تم نے ہنسنا ہی ہے"

فرزانہ اس کے سامنے آ کر روکوع میں کھڑی ہو گئی اور ہنستے ہوئے بولی "بھائی صاحب ہنسنا کوئی جرم ہے؟"

"نہیں جرم کیوں ہونے لگا۔ بڑی نیکی ہے، لیکن پہلے تو ایسی ہنسی میں نے تمہارے چہرے پر کبھی نہ دیکھی تھی"

"پہلے تم نے میرا چہرہ ہی کب دیکھا تھا"

"دیکھا تھا دیکھا کیوں نہیں تھا۔ سو مرتبہ دیکھا تھا"

"تو میں ہنستی نہیں تھی"

"ہنستی تھی لیکن اس طرح سے نہیں ہنستی تھی"

"پہلے کیسے ہنستی تھی بھلا"

"اُلّو کے پٹھوں کی طرح حرامزادوں کی طرح"

"توبہ توبہ۔ گالیاں" اس نے باری باری دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا اور دوپٹہ منہ میں ٹھونس

کر ہنستی ہوئی باہر بھاگ گئی۔

ہمارے دوست کا بیان ہے کہ وہ فرزانہ سے ہر بات کی توقع رکھ سکتا تھا، لیکن یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ اس کو میرے ہوتے ہوئے کسی اور سے محبت ہو سکتی تھی۔ ہم نے کہا شاید تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو اس کو کسی اور سے محبت نہ ہوئی ہو اور وہ تمہارا ہی دم بھرتی ہو۔"

اس نے کہا: "یہی تو میں کہتا ہوں کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں لیکن مجھے غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔ میں ٹھیک سمجھتا ہوں۔ ہم نے کہا تمہارے پاس ٹھیک سمجھنے کا ثبوت ہے۔

اس نے کہا: "میرے پاس کوئی ثبوت نہیں، لیکن میں خدا کو برحق سمجھتا ہوں۔"

ہم نے کہا: "خدا کا تصور تو تمہیں تمہارے والدین نے دیا ہے، تمہارے معاشرے نے دیا ہے۔"

اس نے کہا: "یہ تصور میرے اندر نے دیا ہے، میرے وجود نے دیا ہے۔"

ہم نے کہا: "تمہیں اندر سے کوئی آواز آتی ہے؟"

اس نے کہا: "بالکل نہیں۔"

ہم نے کہا: "پھر؟"

کہنے لگا: "مجھے نہ اندر سے آواز آتی ہے نہ باہر سے نہ زمین سے نہ آسمان سے، لیکن آتی ہے۔"

ہم نے کہا: "یہ پھر آتی کہاں سے ہے؟"

اس نے کہا: "فرزانہ سے آتی ہے، اس کی ہنسی سے آتی ہے، اس کی رفتار سے آتی ہے۔"

"کیا کہتی ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے کہا: "کہنا کیا ہے۔ وہی کہتی ہے جو میں سنتا ہوں۔"

ہم سب نے یک زبان ہو کر کہا: "اس سالے کے جوتے مارو۔"

اس نے ہمارے چہروں کو ایک ایک کر کے دیکھا اور پھر رونے لگا۔ ہم میں سے کسی نے اس کو چپ کرانے کی کوشش نہ کی۔ روتے روتے اس کی گھگھی بندھ گئی اور پھر وہ خود ہی خاموش ہو گیا۔ آنسو پونچھ کر مسکرایا اور مسعود سے کہنے لگا: "یار مجھے ایک گلاس پانی تو پلا۔" مسعود ایک گلاس پانی لے آیا اور ہم اسے پانی پیتے دیکھنے لگے۔ پھر اس نے ہنس کر کہا: "یار حد ہو گئی۔" اور گلاس تپائی پر رکھ دیا۔ ذرا سا جھک کر اس نے فرش پر اپنے جوتے سیدھے کیے اور پھر ہنسنے

لگا۔ اس کے ہنسنے کی آواز کافی بلند ہوگئی تو مسعود نے کہا: "ہوا کیا؟" اس نے اس طرح ہنستے ہوئے کہا۔
"یہ عورت ذات بڑی بے وفا ہوتی ہے۔"
مُفتی نے کہا: "الحمدللہ ہوتی ہے، خدا اسے خوش رکھے۔"
"لیکن یہ تو بہت ہی بے وفا نکلی۔" اس نے حیرت کے ساتھ کہا: "کل شام تو اس نے حد ہی کر دی؟"
ہم سب کی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز ہوگئیں۔ وہ پھر مسکرایا اور ہنسنے لگا۔
مسعود نے کہا: "اب بکے گا بھی یا اسی طرح ہنسے جائے گا۔"
مُفتی نے کہا: "ٹھیک ہے یار، اس کو ہنسنے دو۔ کم از کم ایک چیز تو سیکھ لی ہے اس نے اپنی گل پٹاری سے۔"
"مَیں اس کی طرح ہنستا ہوں مُفتی، اس کی طرح سے۔" وہ چیخا: "اس مکاری سے، اس عیاری سے۔ لعنت ہو تم پر۔"
"لیکن حد کیا ہوئی۔" مسعود نے پُوچھا۔
"کچھ نہیں یار دفع کرو۔ یہ ذات ہی ایسی ہے کوئی اور بات کرو۔"
"اس سے اچھی اور کیا بات ہوگی؟" مُفتی نے کہا۔
"دفع دفع دفع۔" اس نے دونوں زانو زور سے ہلاتے ہوئے کہا: "دفع دُور مردُود نہ فاتحہ نہ دُرود۔"
پھر ہم تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوگئے اور کافی دیر تک زبردستی خاموش رہے۔
"حد ہوگئی یار۔" اس نے اپنے آپ سے کہا: "ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں؟"
"کیسے؟" مسعود نے پُوچھا۔ "یہی فرزانہ جیسے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔
"کیا کیا اس نے؟" مسعود مرا جا رہا تھا۔
"کرنا کرانا کیا تھا۔" مُفتی نے زانو پر ہاتھ مار کر کہا: "سم پر آ کر خالی دے گئی۔"
"توبہ، توبہ۔" اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا: "چالاکی، صاف چالاکی، سُدھی چالاکی۔"
جب ہم نے اس فقرے کا کوئی جواب نہ دیا تو وہ خود ہی کہنے لگا: "جب مَیں کل شام اُن کے گھر بینک کے پاس کھڑا ہاتھ دھو رہا تھا اور میرے دونوں ہاتھ جھاگ سے لتھڑے ہوئے تھے تو وہ آہستگی سے آئی۔ حد ہوگئی یار۔ کمال ہوگئی۔ مَیں کھڑا ہوں اور وہ مالنوں والا سامنے ڈرائنگ روم

میں بیٹھا ہے اور وہ لوگ تاش کھیل رہے تھے اور یہ ان کے لیے پلیٹ میں بسکٹ ڈال کر لے جا رہی ہے اور وہ لوگ چائے پی رہے ہیں اور میں جیسے اس دُنیا میں موجود ہی نہیں ہوں۔"

اور اس نے سارے بسکٹ لے جا کر مالٹے ڈالے کر دے دیئے۔" مسعود نے جلدی سے کہا۔

"لکھ لعنت تم پر مسعود۔" مُفتی نے تالی بجا کر کہا۔ "او کم بخت اُس نے نہیں یہ کہہ رہا ہے، وہ آہستگی سے آئی اور اس کے آگے پلیٹ کر کے بولی: "لو بسکٹ کھاؤ۔" کیوں بھئی یہی کہا ناں اس نے؟ یہ قوم بڑی چالاک ہوتی ہے جب دونوں ہاتھ بندھے ہوں۔ رسّی سے یا ہتھکڑی سے یا صابن کے جھاگ سے پھر عورت ضرور کچھ نہ کچھ آفر کرتی ہے۔ کیوں بھئی؟ اور جو سیانے ہوتے ہیں میرے جیسے وہ صابن سمیت بسکٹ اُٹھا لیتے ہیں اور جو میزلی ہوتے ہیں اس جیسے فیس ٹی ڈیش وہ انکاری ہو جاتے ہیں، حالانکہ اس رستے میں پھسلن سے نہیں گھبرانا چاہیے۔ کون صابن تھا؟"

ہمارا دوست پھر ہنسا اور سر جھٹک کر بولا: "حد کر دی یار اس نے۔"

مُفتی نے کہا: "مسعود جی ہمارے پُرانے بزرگ سن لائیٹ صابن زیادہ پسند کرتے تھے میں اس صابن پر ایک کتاب لکھ سکتا ہوں۔ بڑے بڑے واقعات مجھے یاد ہیں۔"

مسعود نے کہا: "پہلے اس کی بات تو سُن لو مُفتی جی۔"

"سُن لی سُن لی۔" مُفتی نے سر ہلا کر کہا: "سمجھ لی۔ اب اس میں رہ کیا گیا ہے۔"

اس نے ہمیں بُھلا کر اپنے آپ سے کہنا شروع کیا: "حد ہو گئی یار۔ میں سنک کے پاس کھڑا ہاتھ دھو رہا تھا اور میرے دونوں ہاتھ صابن سے لتھڑے ہوئے تھے۔ وہ بسکٹوں کی پلیٹ لے کر آہستگی سے میرے پاس آئی اور میرے بائیں گال کو زور سے چوم کر بولی: "یہ کیا سڑی ہوئی شکل بنا رکھی ہے۔" اور پھر تیزی سے پلیٹ لے کر چائے پینے والوں کے پاس چلی گئی۔

"مسعود نے زمین سے اپنی چپلی اٹھا کر کہا: "اس حرامزادے کے جُوتے مارو ابھی رو رہا تھا سؤر۔"

اس نے پھر اپنے آپ سے کہنا شروع کیا: "حالانکہ اس کی ضرورت نہ تھی۔ کبھی ایسی بات ہوئی ہی نہ تھی۔ کبھی اس کی توقع ہی نہ تھی۔ یہ اس نے کیوں کیا، میرے ساتھ ایسی چالاکی کیوں کی؟ سُدھی چالاکی۔"

پھر اس کا چہرہ مغموم ہو گیا اور فرزانہ کی بے وفائی کا دھواں اس کے گال پر پھیلنے لگا۔

جب مُفتی نے اس حادثے پر تنقید نہ کی تو مسعود نے اپنی چپلی پھر فرش پر رکھ دی۔ تھوڑی دیر خاموشی

رہی پھر وہ کہنے لگا: "اس نے میرا دل کھٹا کر دیا یار۔"

"اب کیا ارادہ ہے؟" مُفتی نے آہستگی سے پوچھا۔

"آج شام پھر اس کے یہاں جا رہا ہوں۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

جب انسان کا دل کھٹا ہو جاتا ہے تو وہ دل کھٹا کرنے والے کی یاد کا سوڈا منٹ ہر وقت اپنے پاس رکھتا ہے۔ تنہائی میں بھی یہ گولیاں چوستا ہے اور دوسروں کے ساتھ مل کر بھی ان سے ٹریٹنگ کرواتا رہتا ہے۔ سوڈا منٹ کی یہ سپلائی ایک طویل مدت تک ختم نہیں ہوتی اور بے وفا لوگوں کی دل کھٹا کر دینے والی باتیں سُناتا ہُوا یہ انسان معدے اور ڈوڈنم میں السر لے کر چُپ چاپ یہاں سے رخصت ہو جاتا ہے۔

جھیل سیف الملوک کا کوئی اثر آثار نہ تھا اور ہم آہستگی سے چلے جا رہے تھے۔ وہ ہم سب سے آگے تھا اور تقریباً اس کے ساتھ ہی لیڈر۔ پھر مَیں اور میرے ساتھ عمّاد مسعود اعظمی اور مُفتی ذرا پیچھے تھے۔ مَیں نے دیکھا اس کے ساتھ پُرانی یادیں لپٹی ہوئی تھیں اور اس کی ٹانگوں سے سوچنے کا عمل جاری تھا۔ مَیں نے کہا: "دیکھو عمّاد اس سالے کی ٹانگوں سے اب بھی یاد کی بیڑیاں بندھی ہیں اور ان کی آواز یہاں تک آ رہی ہے۔"

"اُف شاہ جی!" عمّاد پُورے زور سے چلّایا۔ "مَیں ابھی یہی بات یہی فقرہ کہنے کے لیے منہ کھول رہا تھا کہ آپ بول پڑے۔ صرف بیڑیوں کی جگہ میں شیکلز کا لفظ استعمال کر رہا تھا۔"

پھر اس نے پلٹ کر کہا: "مُفتی جی دو ذہنوں میں ایک خیال ایک ہی وقت میں کیسے آ جاتا ہے؟"

اعظمی نے کہا: "صلح ہو تو اس کو شاعری میں توارد کہتے ہیں، ناراضگی ہو تو سرقہ۔ ویسے اس طرح سے کبھی ہُوا نہیں، واہیات بات ہے۔"

"ہوتا ہے ہوتا ہے کیوں نہیں" مسعود نے وثوق سے کہا۔ "ٹیلی پیتھی کا نام نہیں سُنا۔ یہی تو وہ چیز ہوتی ہے جس سے خیال ایک ذہن سے دوسرے ذہن میں منتقل ہو جاتا ہے۔"

مُفتی نے کپتان کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا: "اُتار دیا، اُتار دو مجھے۔ پھر جاہلوں نے ایسی بات شروع کر دی جس کے بارے میں اِل کا نام کو نہیں جانتے۔"

کپتان نے مُفتی کو اپنی پیٹھ سے اُتار کر نیچے کھڑا کر دیا اور کافی دیر تک مُفتی کا ازار بند اس

کی ٹانگوں کے درمیان جھولتا رہا۔ اس نے ہم کو ٹیلی پیتھی اور سائیکو کائیسز پر ایک لمبا چوڑا لیکچر دے ڈالا اور پیراسائیکولوجی کی اصطلاحات میں الجھا دیا۔ مسعود نے کہا "مُفتی یار تمہاری سائیکولوجی بھی گشتی عورت کی طرح ہے۔ کبھی کسی کی بغل گرم کرتی ہے، کبھی کسی کا دل لبھاتی ہے۔ قابو میں کسی کے نہیں آتی۔"

مُفتی نے کہا "یہ علم ہی گشتی ہے کسی کے قابو میں نہیں آتا۔ اب تک تحلیل نفسی ہی کا کوئی حتمی اور آخری فیصلہ نہیں ہُوا۔"

"ریشہ خطمی کا فیصلہ البتہ ہوگیا ہے۔" اعظمی اپنے مخصوص انداز میں بولا اور عمّاد چڑ کر کہنے لگا "اس کو لفظوں کے اُلٹ پھیر کا چسکا ہے مطلب چاہے نکلے نہ نکلے۔"

"کیوں مطلب کیوں نہیں نکلتا؟" اعظمی سنجیدہ ہوکر بولا۔ "فرائیڈ کا سارا فلسفہ ریشہ خطمی سے تعلق رکھتا ہے۔ کیوں مُفتی جی؟"

مُفتی نے اعظمی کو ایک مہذب سی گالی دے کر کہا "سالا ٹھیک بکواس کرتا ہے۔"

ہم پھر چلنے لگے تو کوہستانی زمین پر بیٹھ گیا اور مُفتی نے اس کا کندھا تھپتھپا کر کہا "خان بابا! ابھی مَیں چند قدم چل سکتا ہوں، فکر مت کرو۔"

اب پہاڑ پر راستہ تنگ ہوگیا تھا اور دونوں طرف اُگی ہوئی جھاڑیوں کی قسمیں بدل گئی تھیں۔ سب کی شاخیں مختلف تھیں، پتّے مختلف تھے، پھُول مختلف تھے اور ان کا جسم نیچے رہ جانے والی جھاڑیوں سے مختلف تھا۔ ہم میں سے ہر ایک تھک چکا تھا، لیکن زبان سے کوئی بھی اقرار نہ کرتا تھا۔ پاؤں تو راستے پر ٹھیک پڑتے تھے، لیکن ٹانگوں میں سکت نہیں رہی تھی۔ ہم اپنی قوّت کے بَل پر نہیں، بلکہ قوّتِ ارادی کے بَل پر چل رہے تھے۔ قوّتِ ارادی کے بَل پر چلنے والے منزل تک تو پہنچ جاتے ہیں لیکن ان کی شکلیں اور شخصیتیں انسانوں کی سی نہیں رہتیں۔ فتح مند اور کامیاب لوگوں کی شکلیں بُل ڈاگوں کی سی ہوتی ہیں۔ ان کی آنکھیں لال، چہرہ بھر کم اور بازو مضبوط ہوتے ہیں اور ان کی زبانیں ہر وقت ان کے مُنہ سے باہر لٹکا کرتی ہیں۔ راہ میں تھک کر سو جانے والے خرگوش بڑے نرمل ہوتے ہیں۔ وہ منزل تک تو نہیں پہنچ سکتے، لیکن ان کی پوستین بڑی نرم، کان بے حد ٹھنڈے اور آنکھیں بڑی شانت ہوتی ہیں۔ وہ مہاتما بُدھ کے بھکشو ہوتے ہیں جنہوں نے خواہش کو مار کر اپنے آپ سے صلح کر لی ہوتی ہے اور ان کے اندر

سیز فائر ہو چکا ہوتا ہے۔

ہمارے درمیان ایک ایسا ساتھی بھی تھا جو آج سے کئی سال پہلے جب نیا نیا آزاد کشمیر ریڈیو پر ملازم ہو کر آیا تھا تو نوجوان تھا اور تازہ تازہ کالج سے برآمد ہوا تھا۔ اس کا چہرہ تانبے کی طرح سُرخ تھا اور دیسی ہی خوشبو رکھتا تھا۔ اس کے بال بنانے اور کپڑے پہننے کا انداز ہم سب سے نرالا تھا۔ وہ ہم سب سے پہلے ریڈیو سٹیشن جایا کرتا تھا اور رات کو سب سے بعد میں لوٹا کرتا تھا۔ پہاڑی سے اُترتے ہوئے وہ ایک خاص قسم کی سیٹی بجایا کرتا جس کا میوزک باغوں اور بہاروں والا سے ملتا جُلتا تھا۔ ہم نے ابتدا میں اس سے دوستی کرنے کی کوشش کی اور اس نے ہماری پیش قدمی کا جواب محبت اور خوش خلقی سے دیا بھی اور عین ممکن تھا وہ صرف ہمارے جوگا ہو کر رہ جاتا بھی کہ اچانک اس پر ایک حملہ ہُوا۔ اندھیری رات کی یلغار، برف کا شبخون، گوریلے کا حملہ۔ پہاڑی اوٹ سے ایک عورت گہرے سبز رنگ کا لانگ کوٹ اور جوگیا ڈوپٹہ سر کے گرد لپیٹے نمودار ہوئی اور اس سے چمٹ گئی۔ کچی تازہ بھُربھُری برف میں دونوں گرے اور نیچے تک، پہنچ گئے۔

ایک مرتبہ مَیں اپنے کمرے میں بیٹھا سکرپٹ لکھ رہا تھا اور باہر شدید برفباری ہو رہی تھی۔ نمی کی وجہ سے سگریٹ بار بار سُلگانی پڑتی تھی اور ماچس ختم ہو گئی تھی۔ مَیں نے کنٹین والے کو آواز دی کہ ہاف سیٹ چائے اور ایک ماچس بھیجو۔ لڑکا تھا اناڑی، چائے کا ٹرے ایک ہاتھ پر اُٹھا کر کنٹین سے میرے کمرے کو یُوں چلا جیسے تارپہ لیڈی چلا کرتی ہے۔ پاؤں پھسلا اور گرم گرم چائے دانی برف پر گری اور میرے دیکھتے دیکھتے کئی فٹ برف کے اندر دھنس گئی۔ لڑکے نے اس کو نکالنے کی احمقانہ کوشش کی تو اِرد گرد سے بھُربھُری برف کا ایک ڈھیر وہاں پھسل آیا۔ کنٹین والے نے آواز دے کر کہا: رہنے دے اب اس سالی چائے دانی کو اور واپس تشریف لے آ۔ اب یہ گرمیوں میں نکلے گی۔

ہمارا ساتھی اور سبز کوٹ والی جب برف پر گرے ہوں گے تو اپنی حدّت کی وجہ سے کئی گز اندر دھنس گئے ہوں گے۔ اُس وقت ہم نے نہیں دیکھا صرف مُفتی نے دیکھا تھا اور چونکہ وہ ہم سب میں سے دانا اور عمر میں زیادہ تھا اس لیے کنٹین کے لونڈے کی طرح اس جوڑے کو برف سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا اور احمقانہ کوشش میں اس نے ہمارے دوست کو اس کے ساتھ اگلی گرمیوں تک کے لیے دفن کر دیا۔

وہ خاتون ہمارے دوست سے کوئی بارہ برس بڑی تھی۔ لمبا قد، خوبصورت چہرہ، بڑی بڑی

آنکھیں دُہرا بدن اور پختہ ارادہ۔ ہمارا غزالِ رعنا اس شیرنی کے ساتھ کلیلیں بھرنے کا عادی ہو گیا تھا اور اس کے پنجوں پر اپنی تھوتھنی رگڑ رگڑ کر لبِ لعلین میں رنگ بھرتا رہتا تھا۔ یہ بات سٹیشن پر اتنی عام ہوئی کہ پاٹ صاف کرنے والے جمعدار بھی ہر وقت مزے سے انہی کا تذکرہ کیا کرتے اور ہم کو غسل خانوں میں جاتے ہوئے بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا۔

ایک شام مشہود نے اپنے مخصوص انداز میں کہا: "اڑتالیس اعشاریہ چار میٹر پر ہم آزاد کشمیر ریڈیو سے بول رہے ہیں۔ شام کے ساڑھے سات بجے ہیں، جمیلہ اختر سے ایک لوک گیت سنیئے۔" پھر اس نے فیڈ کھولا، لیکن کوئی آواز نہیں۔ وہ کنٹرول رُوم کی طرف بھاگا۔ کوئی نہیں۔ ٹرڈیو میں دیکھا جمیلہ اختر موجود ہے۔ اشارہ نہیں آیا۔ ایک منٹ گزر گیا۔ سارے سٹیشن پر بھگڑتول مچ گئی۔ سٹینڈ بائی ڈسک فیڈ آن کر دی گئی۔ ہم اِدھر اُدھر بھاگے کوئی اتا پتا نہ ملا۔ ہمارے ساتھی کا معلوم نہ ہُوا۔ مُفتی پریشان تھا، مسعود خوفزدہ تھا، عمر کانپ رہا تھا اور نیچے سے سٹیشن ڈائریکٹر کے فون پر فون آ رہے تھے۔

جمعدار چھوٹی پہاڑی کے پیچھے نجاست گرا کر آ رہا تھا اور سلور کا گندہ پاٹ بجا بجا کر گا رہا تھا۔

"اوہناں پریاں دی عمر ہو چکی پانی شیر دی جُوہ دا پیندیاں نی۔" مفتی نے آگے بڑھ کر پُوچھا۔ للّو کدھر ہیں؟"

للّو نے ہاتھ کے اشارے سے کہا: "ادھر۔"

"دونوں؟" مُفتی نے پُوچھا۔

"ہاں جی دونوں۔"

"ان کو بُلا کر لاؤ جلدی سے۔"

"مشکل ہے مُفتی جی۔" للّو نے ہنس کر کہا: "شیرنی نے ہرن کو پنجوں میں پکڑا ہُوا ہے اور اس کی گردن سے خون چاٹ رہی ہے۔"

پھر یہ معاملات حد سے بڑھ گئے اور اس خاتون کے خاوند اور ہمارے دوست کے درمیان ڈوئیل فائیٹ کرنے کی نوبت آ گئی۔ دونوں نے پہلے اپنی اپنی دلیلوں کی تلواریں نکالیں، پھر دھمکیوں کے خنجر چمکے۔ پھر چیلنج کے پستول چلے اور آخر یہ فیصلہ ہُوا کہ معاملہ خاتون پر چھوڑ دیا جائے۔ اس خاتون نے بڑے مشفقانہ انداز میں اپنی ہرنی کی تھوتھنی چاٹی اور اُسے کہا کہ پہلے اپنے گھر والوں کو جا کر راضی کرے۔ ہمارا دوست ہَوا کے گھوڑے پر سوار گھر پہنچا۔ اپنی والدہ سے تمام قصّہ بیان کیا۔ اس کے